(غلام گردش)

اقتدار کے منجمد معاملات!

شاہ جی حیرت انگیز انسان ہیں۔ پچھتر برس کا متوازن نوجوان۔ پاکستان اور برطانیہ میں انکا وسیع کاروبار ہے۔ گرمیاں لندن میں اور سردیاں پاکستان میں گزارتے ہیں۔ دوستی تقریباً دس برس پہلے ہوئی اور پھر کافی مضبوط ہوگئی۔ شاہ جی صاحب کمال صاحب مطالعہ انسان ہیں اور پاکستانی ریاست پر ایک منفرد طرزِ فکر رکھنے والی شخصیت ہیں۔ سیاسی معاملات پر انکی رائے بے حد مختلف ہوتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ کہ شاہ جی ایک پڑھے لکھے بابے ہیں جنہیں ملکی سیاست کی مدوجزر کا بخوبی علم ہے۔

جیسے ہی جمہوری حکومت کا دورانیہ ختم ہوا۔ شاہ جی کے بے لاگ تجزیے آنے لگے۔ ویسے جمہوری دور لکھنا مناسب نہیں ہے۔ اسلیے کہ یہ دس برس شخصی بادشاہت کی بدترین مثال رہے ہیں۔ اسے سویلین ڈکٹیٹر شپ لکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ پر یہ بھی عجیب سی لسانی ترکیب ہے۔ بہرحال دس برس جو کچھ بھی تھا، اسے جمہوری دور کہنے کیلئے بہت زیادہ مبالغہ آرائی چاہیے۔ سندھ میں زرداری صاحب اور انکے مصاحبین کی سلطنت تھی اور پنجاب میں شہباز شریف، بلاشرکت غیرے، اقتدار پر قائم تھے۔ کسی سوال وجواب سے مستثناء، ہر طرح کے سیاہ وسفید کے مالک۔ چند سرکاری افسروں نے انہیں ہر ایک سے اس کمال عیاری سے دور کردیا تھا۔ ان سے بھیانک سرکاری غلطیوں کا ارتکاب بھی کروالیا گیا۔ مگر اب وہ مصاحبین مزے کررہے ہیں اور شہباز شریف کیلئے ہر طرف سے آندھی اور طوفان ہے۔ انکے ایک چہیتے نے چار دن پہلے فرمایا کہ اسکا تو شہباز شریف سے سرکاری سا واجبی تعلق تھا۔ انہوں نے کبھی بھی سابقہ وزیراعلیٰ سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ مگر صرف چند ہفتے پہلے تک موصوف ہر وقت دربار میں حاضر رہ کر، دیگر تمام لوگوں کے خلاف بدترین ہرزہ سرائی کررہے ہوتے تھے۔ بہرحال بات شاہ جی کی ہورہی تھی۔ حکومت ختم ہونے سے کئی ہفتے پہلے کہنے لگے کہ یہ لوگ اب اقتدار میں نہیں آئینگے۔ سادگی سے گزارش کی کہ ن لیگ نے کمال ترقیاتی کام کیے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ الیکشن میں واپس نہ آسکیں۔ جواب تھا کہ انہیں پانچ سال کی مدت صرف اسلیے پوری کرنے کی اجازت دی گئی ہے کہ یہ غلطیاں درغلطیاں کریں۔ اپنا مذاق خود اُڑوائیں۔ جیسے لاہور میں اورنج ٹرین کا افتتاح تھا۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ یہ منصوبہ ابھی مکمل نہیں ہوا مگر پھر بھی چند منٹوں کیلئے ٹرین چلادی گئی۔ وزیراعلیٰ، ہاتھ ہلاتے رہے۔ مگر نیچے کوئی ہجوم تو کیا، ایک بھی آدمی نہیں تھا۔ لیکن شاہ جی، بہرحال، ایک بین الاقوامی سطح کا کام تو ہوا ہے۔ جواب تھا کہ یہ محض بتایا جارہا ہے۔ جس دن کوئی ادارہ اس میٹروٹرین کے معاملات کو دیکھے گا، تو حیران کن غفلتیں سامنے آئینگیں۔ ویسے ہی جیسے مال روڈ پر انتہائی غیر معیاری کام کیا گیا۔ ایک ہی بارش نے وہاں مہیب گڑھا بنادیا۔ سوچنے لگا کہ یہ دونوں باتیں درست ہوسکتی ہیں۔ بہرحال بات اُدھوری سی رہ گئی۔

تین دن پہلے شاہ جی دفتر آئے تو کہنے لگے کہ الیکشن ضرور ہونگے۔ جس سیاسی گروہ کو نکالنا ہے، اسے شہید بننے کی اجازت بھی نہیں دی جائیگی۔ شاہ جی سے سوال کیا کہ آپکی نظر میں پاکستان کی سیاست اور سیاستدانوں کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ سیاسی جنگ اور بے وجہ کھینچا تانی کی اصل وجہ کیا ہے۔ شاہ جی سوچ میں پڑگئے۔ کہنے لگے بلیک کافی منگواؤ۔ کافی آتے ہی چند گھونٹ پیے۔ پوچھنے

لگے۔ڈاکٹر صاحب، کیا میں آپکو بیوقوف نظر آتا ہوں یا کسی طریقے سے فارغ آدمی دکھائی دیتا ہوں۔جواب یقیناً نفی میں تھا۔کہنے لگے صرف ایک وجہ نہیں ہے۔کئی وجوہات ہیں۔بتاتا ہوں مگر ایک شرط پر۔جب تک جواب دیتا رہوں، آپ نے خاموش رہنا ہے اور بلیک کافی منگواتے رہنا ہے۔خاموشی سے سننا شروع ہوگیا۔کہنے لگے، پہلی بات تو یہ ہماری جینز میں اختلاف رائے کو برداشت کرنا نہیں ہے۔ہم سیاسی اختلاف کو ذاتی جنگ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔اسکی بھی وجہ ہے برصغیر میں کئی ہزار برس سے مساوات یا برابری کی سطح سے حکومت کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے۔مزاج میں ہے کہ شخصیت پرستی کے عذاب میں جلتے رہیں۔قائداعظم جب گورنر جنرل تھے، تو ان سے سارے سیاستدان گھبراتے تھے۔ڈرتے تھے۔لہذا انکو کسی بڑے سیاسی مسئلے کا شکار نہیں ہونا پڑا۔مگر لیاقت علی خان سے اب تک ہمارے سیاسی مزاج میں ایک فیصد بھی مثبت تبدیلی نہیں آئی۔بلکہ اب تو سیاسی رویہ حد درجہ منفی اور سخت ہو چکا ہے۔صدر ایوب ایک متوازن مزاج کا شخص تھا۔اس میں انقلابی حدت نہ ہونے کے برابر تھی۔مگر جب محترمہ فاطمہ جناح نے اسکے خلاف سیاسی میدان میں آنے کا اعلان کیا تو ہر طریقے سے ریاستی مشینری اس بزرگ خاتون کے خلاف استعمال کی گئی۔حد تو یہ کہ انہیں ہندوستانی ایجنٹ تک قرار دیا گیا۔ایوب خان کے مصاحبین نے محترمہ فاطمہ جناح کی ذات پر رکیک ترین حملے کیے۔شاہ جی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔کہنے لگے کہ میری زبان اجازت نہیں دیتی کہ وہ جملے دہراسکوں۔اس وقت میں نوجوان تھا اور چاہتا تھا کہ محترمہ فاطمہ جناح الیکشن میں کامیاب ہوں۔اگلا دور دیکھیے۔یحییٰ خان نے اپنی ساری توانائی اور وقت، دنیاوی عیش پر اس طرح صَرف کی کہ ملک ہی برباد ہوگیا۔مگر اس طرزِ حکومت سے پہلے سوال کھڑا ہو چکا تھا کہ مشرقی پاکستان کے بنگالی نوجوان اتنے علیحدگی پسند کیوں ہو چکے ہیں۔اصل میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد، بہت پہلے رکھی جا چکی تھی۔بنگالیوں نے اپنے سیاسی نظریہ کو بیان کیا تو ایک دم اسی اختلاف کو ملک دشمنی قرار دیدیا گیا۔انہیں برابری کی سطح پر کبھی بھی تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔یہ سارا کام ایوب خان کے دور میں حب الوطنی کے نام پر ہوتا رہا۔ہمارے سیاستدانوں نے ملک توڑ دیا مگر اپنے مزاج کو تبدیل نہیں کیا۔شاہ جی کو کافی کا ایک اور کپ منگوا کر دیا اور اسی بہانے سے عرض کی کہ شاہ جی یہ باتیں تو ہر ایک کو معلوم ہیں۔اس میں تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔اب آپ بھٹو اور ضیاء الحق کی دشمنی کا ذکر کرینگے۔یہ باتیں تو عام سی ہیں۔

شاہ جی ایک دم مزید سنجیدہ ہوگئے۔کہنے لگے کہ اقتدار کے کھیل میں صدیوں سے کوئی نئی بات نہیں ہے۔صدیاں نہیں بلکہ ہزاروں سالوں سے جاری کھیل صرف اور صرف مغربی دنیا میں بدلا ہے۔بدقسمتی سے ہمارے خطے میں جوں کا توں ہے۔ہر حکومت میں صرف دو فریق ہوتے ہیں۔ایک حاکم اور دوسرا، اس حاکم سے حکومت چھیننے کی جستجو کرنے والا۔ہر حکومت میں عوام بے معنی ہوتے ہیں۔پہلے بھی اور آج بھی۔ہم لوگ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے برصغیر پر ایک ہزار سال حکومت کی۔مگر کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس زمانے میں عام آدمی کی زندگی کس معیار کی تھی۔کیا کسی قسم کا انصاف میسر تھا۔کیا قحط میں غلہ کی فراہمی مکمل تھی۔کیا واقعی مذہبی آزادی بھی تھی۔کیا ہر بادشاہ کے مرنے کے بعد خانہ جنگی اور سازشوں کا ایک نیا دروازہ نہیں کھل جاتا تھا۔کیا مسلمان بادشاہ کسی مسلمان باغی کو برداشت کرتا تھا۔ہرگز نہیں۔ہم تسلیم ہی نہیں کرتے کہ کسی بھی حاکم، بادشاہ، سلطان، شہنشاہ یا منصب دار کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔اسکا اصل مذہب

صرف اور صرف اقتدار میں رہنا ہوتا ہے۔تمام لوگ اس کھیل کو پہچانتے ہیں۔مگر بات نہیں کر سکتے۔آپ یہاں یہ نہیں کہہ سکتے کہ جرمنی کی چانسلر انجیلنا مرکل،سعودی بادشاہ سے بہت بہتر اور انسان دوست ہے۔یہ بھی نہیں کہہ سکتے،کہ کینیڈا کا جسٹن ٹروڈو،ایران کے سخت مولویوں سے،ہر طریقے سے اعلیٰ ہے۔دونوں فرنگی حکمرانوں میں سادگی ہے۔یہ ہزاروں مسلمانوں کو پناہ دے چکے ہیں۔کیوں!صرف اسلئے کہ مغربی دنیا ایک مہذب مربوط نظام میں زندگی گزار رہی ہے۔جہاں وزیراعظم اپنے بیٹے،بیٹی یا سمدھی کو بغل میں بٹھا کر سیاسی تقریر نہیں کر سکتا۔دنیا کے طاقتور ترین شخص یعنی امریکی صدر،براک اوباما کی بیٹی،واشنگٹن کے ایک کیفے میں ویٹرس کا کام کرتی رہی۔آنے جانے کیلئے وائٹ ہاؤس کا کوئی سرکاری قافلہ یا گاڑیاں استعمال نہیں کی گئیں۔دراصل مغرب میں طرزِ حکمرانی مکمل طور پر تبدیل ہوا ہے۔تبدیلی کا یہ سفر،خون کی شاہراہ سے گزر کر مکمل ہوا ہے۔پورے مغرب نے چرچ کو حکومت سے الگ کرنے کیلئے لاتعداد انسانی قربانیاں دی ہیں۔انہوں نے اپنے امیر اور طاقتور آدمی کو بھی قانون کے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔کیا پاکستان میں کسی حکمران،وزیراعظم،وزیراعلیٰ کی ذاتی سادگی کی کوئی مثال ہے۔

خاموشی سے سن رہا تھا۔میرا سوال تھا کہ پرانی باتیں چھوڑیئے۔اب کیا ہوگا۔شاہ جی نے قہقہہ لگایا۔وہی جو پہلے ہوتا رہا ہے۔شہباز شریف،نواز شریف،زرداری اور دوسرے لیڈروں نے کبھی اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کیا۔اپنے سیاسی مخالفین پر زندگی تنگ کر دی۔جو افسر انہیں پسند نہیں تھا،انکے مستقبل کو برباد کر دیا۔ٹوڈی،میر عالم اور غیر معتبر لوگوں کے نرغے میں آ گئے۔میرٹ کو برباد کر دیا۔کھل کر کرپشن کو فروغ دیا۔اس درجہ خودسری آ گئی کہ وزراء،ایم این اے اور ایم پی اے بھی دو دو سال ان سے ملاقات کرنے سے قاصر تھے۔مگر ایک فریق ایسا تھا جو ان کے قابو میں نہ آ سکا۔وہ تھا سوشل میڈیا۔حزبِ اختلاف سوشل میڈیا بن گیا۔اتنے طاقتور سوشل میڈیا سے جیتنا ناممکن تھا۔لہذا اب جو کچھ ان لوگوں نے اپنے اقتدار بچانے کیلئے کیا۔اب وہی ترکیب مخالف فریق،اقتدار حاصل کرنے کیلئے استعمال کر رہا ہے۔بلکہ اس میں مکمل طور پر کامیاب ہے۔لہذا الیکشن ہو یا نہ ہو،اقتدار اب مخالف فریق کے پاس جا رہا ہے۔شاہ جی اُٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگے،اقتدار کے معاملات صدیوں سے بالکل ویسے ہی ہیں۔سب کچھ منجمد ہے۔کچھ بھی نہیں بدلا!

راؤ منظر حیات